© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

انسانی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز وہ چیز یا نظریہ ہوتا ہے جسے کوئی فرد یا جماعت اپنا مقصود و مطلوب قرار دیتی ہے۔ اسی کے مطابق زندگی کی باقی چیزوں اور افکار و نظریات کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ انسان کے لیے کوئی نظریہ یا شئے اگر کوئی معنویت رکھتی ہے تو اس کا سارا مدار اُس مقصد پر ہوتا ہے جسے وہ اپنی زندگی کی غایتِ اُولیٰ قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص دنیوی مال و متاع کو اپنی زندگی کا مطلوب ٹھیرا لیتا ہے تو پھر وہ ہر ایسا ذریعہ اختیار کرنے کی کوشش کرے گا جس سے اس میں اضافہ ہو اور ہر اُس کام سے گریز کرے گا جس سے اس میں کمی آتی ہو۔ مقاصد سے افراد اور قوموں کی زندگی کے رُخ، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے اور ان کی جد و جہد کے انداز متعین ہوتے ہیں۔

انسان کے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آتا ہے کہ آخر اس کی زندگی کی غایت الغایات کیا ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ جس ذات نے اُسے اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے وہی اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی رضا جوئی کے لیے زندہ رہا جائے کیونکہ اگر اصل حاکم اور مالک کی خوشنودی کو نظر انداز کر کے کسی دوسری ذات کی رضا تلاش کی جائے تو زندگی کا فطری توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسی حقیقت کو سورۂ انعام کے آخری رکوع میں خود قرآن کے لانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ	آپ اعلان کیجیے کہ میری نماز اور میری ہر قسم کی عبادت
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ـ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ	اور قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ـ (رکوع ـ ۲۰)	کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں مجھے یہی حکم دیا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور مَیں سب سے پہلے سرِ اطاعت خم کرنے والا ہوں

باری تعالیٰ کا انسان سے یہ مطالبہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اُسے انسان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ضرورت ہے اور اگر انسان نے یہ روش اختیار کرنے سے انکار کیا تو اُس کے نظام میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔ خالقِ کائنات نے انسان سے اگر یہ مطالبہ کیا ہے تو یہ بھی درحقیقت انسان کی بھلائی کے لیے ہے۔ کیونکہ اگر انسان اصل خالق کو پہچان کر اُس کے سامنے سرِ نیاز خم نہ کرے اور اس کی جگہ کچھ دوسرے خدا بنا لے تو اس کی اپنی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید نے سورۃ لقمان میں شرک کو جو ظلم کہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کی اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس خدا نے اُسے تخلیق کیا ہے وہ اس کی رضا کو زندگی کی اساس بنانے کے بجائے کچھ دوسرے خداؤں سے تعلقِ خاطر پیدا کرلے۔ شرک صرف مٹی اور پتھر کے بتوں اور مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا نام نہیں بلکہ باری تعالیٰ کے حقوق میں کسی دوسرے کو ساجھی بنانے کا نام ہے۔ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر کوئی فرد یا قوم محض زبان سے خدا کو ایک مان لیتی ہے تو وہ توحید کی علمبردار ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اسلام اور غیر اسلامی قوتوں میں کبھی وہ شدید کشمکش برپا نہ ہوتی جو ہم تاریخ کے اوّلین دَور سے لے کر آج تک دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ محض ایک خدا کا زبان سے اقرار کرنے یا انکار کرنے سے آخر زندگی میں وہ ہلچل کس طرح پیدا ہو سکتی تھی جو ہمیں انسانیت کی لمبی تاریخ کے ہر گام پر نظر آتی ہے۔ توحید اور شرک کے مابین اس کشمکش اور اس آویزش کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ توحید محض ایک خدا کے زبانی اقرار کا نام نہیں بلکہ یہ حیاتِ انسانی میں ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کا پیغام ہے جو اُسے اوّل تا آخر خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرے کہ تنہا خدا کی ذات ہی کائنات کی خالق و مالک اور فرمانروا ہے اور اسی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ پوری کائنات مع انسان اس کی مطیع اور فرمانبردار ہو۔ نوعِ بشری کے ماسوا کائنات کی باقی چیزیں تو تکوینی طور پر اس کے تابع ہیں لیکن انسان کو چونکہ فہم و فراست کے ساتھ ساتھ ایک محدود پیمانے پر اختیار اور آزادی بھی دی گئی ہے اس لیے زندگی کے اس قدرے آزاد گوشے کے لیے اس سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ خود بخود اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرضی سے بندگیٔ رب کے تقاضے پورے کرے تاکہ اُس کی اپنی زندگی میں توافق پیدا ہو اور اس کا طرزِ عمل کائنات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے۔

کائنات کے نہایت وسیع و عریض نظام پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہر حرکت متعین ہے اور اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے بڑی عمدگی کے ساتھ پیوست ہے۔ اس کے کسی شعبے میں کسی قسم کا کوئی اختلال نہیں۔ سورج، چاند، سیارے ایک بندھے پروگرام کے تحت اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک لمحہ بھر کے لیے اپنے کام سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی سے کائنات میں ہم آہنگی پیدا ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام میں ذرّہ برابر بھی تساہل کرے تو اس کائنات کا وجود ختم ہو جائے۔ ایک ہمہ گیر نظم ان سب کو اپنا پابند کیے ہوئے ہے اور انہیں ایک متعین راستے پر چلا رہا ہے۔

اسی نظم کا انسان بھی پابند ہے لیکن اس کے ایک گوشے میں اُسے یہ آزادی ضرور دی گئی ہے کہ وہ اگر چاہے تو اس سے انحراف کرے۔ لیکن اس انحراف کا بھی اُسے شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس سے اُس کی زندگی کا پورا توازن بگڑ جاتا ہے جو بالآخر خوفناک تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یہ دیکھیے کہ جو فرد یا قوم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو اُس کے منشا اور مرضی کے مطابق ڈھالنے سے گریز کرتی ہے وہ لازمی طور پر دو خطرناک نتائج سے دوچار ہوتی ہے۔ یا تو اُس کے ہاں شدید خلفشار رونما ہوتا ہے، جو بالآخر اسے تباہ کر دیتا ہے یا پھر دوسری شدید نوعیت کی جکڑ بندیاں اُسے کسی نظم کا پابند بناتی ہیں اور اُسے اس مقام پر لے آتی ہیں جس پر بپھرے ہوئے اور خونخوار جانور زنجیروں میں جکڑ کر رکھے جاتے ہیں۔ آپ یورپ کی گزشتہ دو سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اہلِ یورپ پر جب مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور انہوں نے خدا کی پرستش کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے مفادات کی پرستش بھی شروع کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا یورپ خود غرضوں اور طالع آزماؤں کی ایک وسیع منڈی بن کر رہ گیا۔ ہر شخص کو ناجائز نفع اندوزی کے جس قدر مواقع میسّر آ سکتے تھے اُن سے اُس نے خوب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فائدہ اٹھایا۔ طاقتور طبقوں نے کمزور طبقوں پر دل کھول کر مظالم ڈھائے اور جابر اور سفاک قوموں نے کمزور اقوام کو جس طرح چاہا ہوس زرگری کا نشانہ بنایا۔ انسانیت کی ارفع و اعلیٰ اقدار برباد ہوئیں اور انسان بالکل حیوان بن کر رہ گیا۔ افراد کے مابین نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے بہر حال کوئی ایسی قوت درکار تھی جو اس فرض کو کسی نہ کسی طرح سرانجام دیتی اور اجتماعی زندگی کا شیرازہ منتشر ہونے سے بچاتی۔ چنانچہ الحاد کے سامری نے انسانیت کے گم کردہ راہ قافلوں سے ان کے انسانی حقوق لے کر ایک ایسی ریاست کی صورت گری کی جو ان کی ہدایت کا واحد سرچشمہ، ان کی محبت و عقیدت کا مرکز اور ان کے جذبۂ عبودیت کی تسکین کا ذریعہ تھی۔ عوام نے اس "بت" کے ساتھ عبودیت کا ویسا ہی رشتہ استوار کیا جو ایک خدا پرست اپنے خالق اور مالک کے ساتھ استوار کرتا ہے۔ یہ نیا بت پتھر کی مورتیوں کی طرح کوئی بے جان شے نہ تھا کہ لوگ محض اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے، یا اس کے حضور میں نذر و نیاز پیش کرنے پر اکتفا کرتے اور زندگی کے باقی معاملات کو جس طرح چاہتے چلاتے رہتے۔ یہ نیا خدا بڑا جاندار تھا اور اس نے انسانوں سے پوری قوت سے کہا کہ جو لوگ میرے دائرۂ اختیار میں رہتے ہیں ان پر صرف میری خدائی قائم ہوگی۔ جن لوگوں نے اس کی خدائی کا سکہ تسلیم کیا انہوں نے اس کے مطالبے کے سامنے ہر دوسرے مطالبے کو نظر انداز کیا اور اس کے تقاضوں کے پیش نظر دوسرے سارے تقاضوں کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ اس الٰہ نے اپنے پرستاروں کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ دنیا میں اصل چیز مادی فلاح ہے اور ہر وہ کام صحیح اور درست ہے جس سے اس میں اضافہ ہو اور ہر وہ قول یا فعل غلط ہے جس سے اس میں کمی آنے کا اندیشہ ہو۔ اس ایک نظریہ کے مطابق انسانی زندگی کا پورا نظام مرتب کیا گیا اور اس کی زمام کار ریاست کو سونپ دی گئی۔ اس نظریہ نے انسانوں کی اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت اختیار کرلی جو کسی خدا پرست معاشرے میں ایمان کی ہوتی ہے۔ اس فلسفہ کے ساتھ زندگی کی غایت بدلی ایمان کی اساس بدلی، حیاتِ انسانی کے انداز بدلے، خیر و شر کے معیار بدلے اور معبود و الٰہ کی ذات بدلی۔ اس نئے معبود نے مذہب سے براہِ راست تعرض تو نہ کیا مگر اپنی خدائی کے اس بنیادی تقاضے کو بہر حال تسلیم کروایا کہ اس کی رضا دنیا کی ہر دوسری چیز پر مقدم ہے اور اس کے مقابلے میں کسی بات کا کوئی وزن اور اہمیت نہیں۔

آغاز میں عوام ریاست کی خدائی کے سارے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہے اس لیے انہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دو خداؤں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح نبھانے کی کوشش کی۔ وہ سچے خدا کے ساتھ بھی قطع تعلق پر آمادہ نہ تھے مگر دوسری طرف ریاست کے باطل الٰہ سے منہ موڑنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ اس طرح انہوں نے کچھ مدت تک خدا اور اہرمن دونوں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا۔ مگر یہ دو عملی زیادہ دیر تک چل نہ سکی اور انہیں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں جلد ہی یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کی خدائی ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اگر انہیں خدائے واحد کی پرستش کرنا ہے تو پھر وہ ریاست کو الٰہ نہیں مان سکتے اور اگر انہیں ریاست کو اپنا معبود بنا کر زندگی بسر کرنا ہے تو پھر انہیں خدا سے بے تعلق ہو جانا چاہیے۔

تاریخ انسانی کا یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ اس فیصلہ کن مرحلے میں انسان نے مادی مفادات کی اندھی محبت میں بڑا غلط فیصلہ کیا اور اس بات کو تسلیم کر لیا کہ مملکت کی حاکمیت سب پر حاوی ہے اور اس کے احکام کے مقابلے میں کسی دوسرے کا فیصلہ یا حکم نہیں مانا جا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا نظامِ زندگی مذہب سمیت ریاست کے تابع ہو کر رہ گیا اور فرد اور قوم کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی خالص مادی مفادات کی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں اب بھی کچھ سر پھرے عبادت گاہوں میں خدا کے حضور میں سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت مذہبی تکلف سے زیادہ نہیں۔ ملحد اور بے دین لوگوں کو تو جانے دیجیے یہ خالص مذہبی لوگ بھی اپنی عملی زندگی میں خدا کے بتائے ہوئے راستوں کے بجائے ریاست کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن رہتے اور ریاست کے احکام کو احکامِ خداوندی پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔

بعض سطح بین لوگ مغرب میں کلیساؤں اور گرجاؤں میں گہما گہمی اور مسیحیت کے تبلیغی لٹریچر کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ مغرب کو ابھی تک مذہب سے کافی تعلق ہے، لیکن یہ محض فریبِ نظر ہے۔ خدا کے وجود کا مجرد اقرار اور کتابِ مقدس سے زبانی محبت انہیں خدا کا پرستار اور مذہب کا علمبردار نہیں بناتی۔ خدا کی صحیح معنوں میں بندگی اور مذہب سے سچی وابستگی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ ایک فرد یا قوم اپنی زندگی میں احکامِ خداوندی اور تعلیماتِ ربانی کو کیا اہمیت دیتی ہے۔ اگر وہ ان احکام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان تعلیمات کے مقابلے میں ہر دوسرے حکم اور ہر دوسری تعلیم کو پسِ پُشت ڈالنے کے لیے تیار ہو تو وہ بندگی رب کے دعوئ میں مخلص ہے اور مذہب کے بنیادی تقاضے کو پُورا کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ احکامِ الہٰی کے مقابلے میں مملکت اور ریاست کے فیصلوں کو ترجیح دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت خدا کو اپنا رب نہیں مانتی بلکہ عملاً ریاست کی خدائی تسلیم کرتی ہے۔ اہلِ مغرب خدا کے کس حد تک پرستار ہیں اور ریاست کی غلامی میں کہاں تک گرفتار ہیں اس کے اندازے کے لیے کوئی غیر معمولی عقل درکار نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے ریاست کے مطالبات کے سامنے مذہبی احکام کو کس طرح قربان کیا۔ مذہب انسان کو محبت کی تعلیم دیتا ہے لیکن انہوں نے مذہب کے اس بنیادی حکم کو نظرانداز کر کے اپنی قوم کے علاوہ دوسری اقوام سے نفرت کی تربیت حاصل کی۔ اور انسانوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کی فطری اور مستقل اساس کے بجائے رنگ، نسل اور زبان جیسے اتفاقی حادثات کو اساس قرار دیا۔ مذہب، فرد اور معاشرے کی تعمیر اخلاق سے کرتا ہے ریاست نے اس غرض کے لیے معاشی مفادات پر زور دیا۔ مذہب کے نزدیک زندگی کا مقصد اُخروی فلاح ہے لیکن ریاست نے اس تصور کے برعکس مادّی فلاح و بہبود کو انسان کا انتہائے مقصود ٹھیرایا۔ ریاست کے مطالبات سیلاب کی سی تیزی کے ساتھ بڑھنے شروع ہوئے اور انہوں نے انسانی زندگی کا اس طرح احاطہ کیا کہ اس کا کوئی گوشہ بھی ان کی لپیٹ سے محفوظ نہ رہا۔

انسان کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کا تو ذکر ہی کیا کلیسا اور عبادت گاہیں بھی پُوری طرح اس کی زد میں آگئیں اور وہاں بھی خدا کے نام پر وہی کچھ ہونے لگا جس کی ریاست متقاضی تھی۔ مذہب کے علمبرداروں نے مذہب کو زندگی پر حاوی کرنے کے بجائے خود یہ کہنا شروع کر دیا کہ مذہب کا اجتماعی معاملات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ سیاست، معیشت، معاشرت اور خود مذہب کی خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر تشکیل کی گئی۔

لوگ عام طور پر یہ پوچھتے ہیں کہ مذہب کی مادہ پرستانہ بنیاد کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب خدا کی رضا اور اخروی فلاح مذہب کا مطلوب بننے کے بجائے ریاست کی خوشنودی اس کا مقصود بن جائے تو سمجھ لیجیے کہ مذہب کی اساس بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی سے مذہب کی نوعیت، اس کا مزاج اور اس کی غایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدل جاتی ہے۔ مذہب پھر خدا کی رضا کے لیے زندہ نہیں رہتا بلکہ ریاست اور اجتماعی مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یورپ میں مذہب کے بارے میں یہ نعرہ کہ دین الگ چیز ہے اور سیاست الگ، انسان مذہب کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ مذہب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے، دین کو اجتماعی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہیے، دین ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، یہ سب دین کی مادہ پرستانہ بنیاد کے شاخسانے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل خالص مادی مفادات، جن کی محافظ اور علمبردار ریاست ہے، کے مطابق کرنی چاہیے اور مذہب کو کسی مقام پر ان مفادات کی راہ میں حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔ مذہب کے اس غلط اندازِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین جو انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آیا ہے، مادی مفادات اور اجتماعی تقاضوں، جو درحقیقت مادی تقاضے ہی ہیں، کا تابع مہمل بن کر رہ گیا۔

انسان کبھی بھی دو خداؤں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ اُسے بہرحال جلد ہی اس امر کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس خدا کی خدائی قبول کر کے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اہلِ یورپ نے ریاست اور مملکت کی خدائی کو تسلیم کیا اور مذہب اور اس کے تقاضوں سے دستکش ہوتے گئے۔ معدودے چند افراد کے لیے مذہب کی اگر کوئی حیثیت باقی تھی تو صرف اسی قدر تھی کہ وہ کبھی کبھی گرجاؤں میں پوجا پاٹ کر کے اپنے حاسۂ مذہبی کی تسکین کر لیا کرتے یا یورپین ریاستیں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے مذہب اور حاملین مذہب کی خدمات سے ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھاتیں۔ یورپ میں مذہب جس طرح پسپا ہوا ہے وہ انسانیت کا ایک دلفگار سانحہ ہے۔ البتہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب فطری ضابطے کے عین مطابق تھا۔ جب کوئی فرد یا قوم اپنے لیے ایک ایسی منزلِ مقصود متعین کر لیتی ہے جو مذہب کی ضد ہے تو وہ جب بھی اس کے حصول کے لیے آگے بڑھے گی اُسے لازمی طور پر مذہب، اس کی تعلیمات اور اُس کی روایات کو خیرباد کہنا ہوگا۔ یہ آخر کس طرح ممکن ہے کہ بالکل دو متضاد نظریات کو بیک وقت اپنایا جا سکے۔

مادی مفادات کی علمبردار ریاستوں نے جس انداز سے اپنی خدائی کا سکّہ جما کر اپنے کام کا آغاز کیا اُسے دیکھ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس امر کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ مذہب کا بحیثیت ایک انقلابی قوت زوال یقینی ہے۔ مذہبی احساسات اور عقائد کے مضمحل ہونے کے بعد اہلِ یورپ کے پاس کوئی ایسا ضابطہ باقی نہ رہا جو داخلی طور پر انسانوں کی تربیت کرتا۔ اس بنا پر جُوں جُوں مذہب کمزور ہوتا گیا، ریاست کی جکڑ بندیاں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ مادی مفادات کی محبت نے عوام کو بالکل اندھا بنا دیا تھا۔ اُن کے سامنے صرف دو ہی مقاصد تھے کہ مال و متاع کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کریں اور اس سے اپنے حسی جذبات کی تسکین کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے نئے نئے راستے نکالیں۔ انسان نے اپنی اس لوٹ کھسوٹ کے جواز کے لیے فرد کی آزادی کا فلسفہ گھڑ رکھا تھا۔ چنانچہ معاشرے میں عجیب و غریب قسم کا خلفشار پیدا ہوا۔ جہاں تک مادی مفادات کی نگرانی کا تعلق تھا لوگ ریاست کو معبود مانتے تھے اور اس کی ہدایات کے مطابق ہی طرزِ عمل اختیار کرتے۔ لیکن دنیوی مال و متاع کی ذاتی خواہش انہیں شخصی آزادی کا علمبردار بناتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ہمیں جو تضاد نظر آتا ہے وہ اسی متضاد طرزِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس صورتِ حال نے عجیب و غریب الجھنیں پیدا کر دیں اگر فرد کو آزادی دی جاتی تو وہ مال کی محبت میں اندھا ہو کر اجتماعی زندگی کو شدید نقصان پہنچاتا۔ اس سے تمام یورپی ممالک میں طبقاتی تقسیم نے جنم لیا اور پیدائشِ دولت میں بڑا تباہ کن عدم توازن پیدا ہوا۔ سرمایہ دار وہ اشیاء پیدا کرتے تھے جن میں انہیں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہوتا۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان اشیاء کا قوم کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ منڈیوں میں ضروریاتِ زندگی کی کمی ہوتی گئی اور ان کے مقابلے میں تعیشات کی فراوانی ہو گئی۔ ان حالات میں اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ریاست ہمہ مقتدر رہتی، اس کی جکڑ بندیوں میں اضافہ ہوتا اور اس کا دائرہ کار زیادہ سے زیادہ پھیلتا تاکہ وہ معاشرے کے مائل بہ انتشار اجزا کو کسی حد تک باہم مربوط رکھ سکتی۔

انسانیت کا ایک نہایت غلط رُخ پر ارتقاء ہو رہا تھا کہ اس کے جواز کے لیے اشتراکیت کا فلسفہ معرضِ وجود میں آیا۔ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت سرمایہ داری سے الگ کوئی نظام ہے یا یہ اس کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ یہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ اشتراکیت درحقیقت سرمایہ داری کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اشتراکیت کی تعمیر میں سرمایہ داری نے بنیاد کا کام دیا ہے۔ سرمایہ داری دراصل نام ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ایسے نظامِ زندگی کا جس میں خوب و ناخوب کا معیار مادّی نفع اور فائدہ ہو اور جس میں حیاتِ انسانی کا مقصود صرف مادّی فلاح ہو اور زندگی کے سارے معاملات کو اسی ایک پیمانے سے ناپا جائے۔ جب یہ نظام کسی معاشرے پر مسلط ہوتا ہے تو اس سے مذہب کے عطا کردہ اخلاقی معیارات کا خود بخود گلا گھٹنے لگتا ہے۔ فرد اجتماعی زندگی کی قوت کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے اور ریاست اُس پر پوری طرح تسلط قائم کر لیتی ہے۔

اشتراکیت ریاست کی بڑھتی ہوئی ہوسِ اقتدار کا مظہر اور زندگی کو خالصتاً مادّہ پرستانہ بنیادوں پر اٹھانے کی بھرپور کوشش ہے۔ اشتراکیت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سرمایہ داری کے نفاق اور تضاد کو دُور کرنے کی سعی کی ہے۔ اشتراکیت کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ جب زندگی کی اساس مادّی مفاد ہے تو پھر مذہب اور اخلاق کو انفرادی اور اجتماعی زندگی سے یکسر خارج کر دینا چاہیے۔ یہ الگ بحث ہے کہ کیا اشتراکیت خود بھی ان چیزوں کو پوری طرح مٹانے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے سرمایہ داری کی دو رنگی اور منافقت کو پوری طرح بھانپ لیا ہے۔ جب ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو مادّی نفع و نقصان کے نقطۂ نظر سے حل کرنا ہے تو پھر فرد اور معاشرے کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ اس نقطۂ نظر کے مقابلے میں کوئی اور نظریہ یا معیار پیش کرے۔ اس اصول کے مطابق مذہب واقعی بیکار کی زنجیر، افیون، دھوکہ اور فریب ہے اور یہ جتنی جلدی ختم ہو اتنا ہی مادّی زاویۂ نگاہ سے انسان کے لیے بہتر ہے۔ دوسرے جب زندگی کو خالص مادّی سانچوں میں ڈھالنا ہے تو پھر اس تبدیلی کو عوام کی مرضی پر نہ چھوڑنا چاہیے بلکہ ریاست کو پوری قوت کے ساتھ اس فرض کو سرانجام دینا چاہیے۔ مذہب سے بے تعلقی کے بعد انسان کی حیوانی جبلتوں کو کسی نظام کا پابند کرنے کے لیے کوئی ایسی ہمہ گیر قوت ناگزیر ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہو۔ ان حالات میں شخصی آزادی کی بات کرنا اوّل درجے کی حماقت اور بیوقوفی ہے۔ جس فرد یا معاشرے کی تہذیب کے لیے کوئی داخلی محرکات نہ ہوں اُسے لازمی طور پر ریاست کی جکڑبندیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

جو لوگ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں بُعد و بیگانگی پاتے ہیں انہیں صرف اس بات کو دیکھنے پر اکتفا نہ کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے کہ ایک نظام شخصی ملکیت کا قائل ہے اور دوسرا اس کی نفی کرتا ہے۔ یہ دونوں نظاموں کا بالکل سطحی مشاہدہ ہے۔ ان کے درمیان فرق نوع کا نہیں بلکہ تدریج کا ہے۔ سرمایہ داری الحاد اور مادہ پرستی کی خشتِ اوّل ہے اور اشتراکیت وہ دیوار کج ہے جو اس پر اٹھائی گئی ہے۔ جب ہم سرمایہ داری کا تجزیہ کرتے ہیں تو اسے تین عناصر سے عبارت پاتے ہیں:

(۱) مادی نفع کو انسانی افکار و اعمال کا واحد محرک قرار دینا۔

(ب) مذہبی اخلاق کو حیاتِ انسانی کے گوشوں سے خارج کرنا۔

(ج) اجتماعیت کے دائرہ کا وسیع سے وسیع تر ہونا اور اجتماعی جکڑبندیوں کی گرفت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانا اور اس کے مقابلے میں انسان کی شخصی آزادی کا قلع قمع۔

آپ اگر سرمایہ داری کے آغاز سے لے کر آج تک کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نظام ناگزیر طور پر اشتراکیت کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ جو ممالک اشتراکیت کے شدید دشمن بھی ہیں ان کا مزاج اور انداز کسی مذہبی معاشرے کی بہ نسبت اشتراکیت سے کہیں زیادہ ملتا جلتا ہے۔ مادی مفادات سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی اساس اور بنیاد ہیں اور مذہب کے معاملے میں لوگوں کے اندر عام بیزاری پائی جاتی ہے۔ یا اگر بیزاری نہیں تو بے تعلقی ضرور نظر آتی ہے۔ عبادت گاہوں کے بجائے شراب خانے اور قمار خانے آباد ہیں۔ اخلاق اقدار کا کھلے طور پر مذاق اڑایا جاتا ہے اور ان کی اہمیت بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ فرد پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی حیثیت اجتماعیت کے سیلِ بے پناہ میں خس و خاشاک کی سی ہے جسے وہ جس طرح چاہتی ہے بہا کر لے جاتی ہے۔ شخصی آزادی کی علمبردار ریاستیں بھی اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے اپنے آپ کو ایسے قوانین وضع کرنے پر مجبور پاتی ہیں جن سے ان کی گرفت روز بروز مضبوط ہو۔

اشتراکیت کا خمیر بھی انہی عناصر ثلاثہ سے اٹھایا گیا ہے۔ یہاں بھی مادی سود و زیاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس ہے مگر اسے جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM کا دلفریب نام دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی فنی پیچیدگیوں سے بحث کر اگر سوچا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ نظریہ جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں درحقیقت مادی مفادات کو زندگی کی واحد اساس ثابت کرنے کی نہایت بھونڈی کوشش ہے۔ تاریخ کی مادی تعبیر کوئی تحقیقِ انیق نہیں بلکہ حقائق کو مسخ کر کے لوگوں کو کسی نہ کسی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ باور کرانا ہے کہ انسان نے مادّی سُود و زیاں کے علاوہ نہ تو کسی چیز کے بارے میں کبھی سوچا ہے اور نہ اس ایک مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے تحت کام کیا ہے۔ جس چیز کو یہ لوگ قومی ملکیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور لوگوں کو اس امر کی بشارت دیتے ہیں کہ جو قوم اس پر ایمان لے آئے گی اُس کے سارے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے اور اسے جنتِ ارضی حاصل ہو گی۔ وہ درحقیقت ریاست کی کبریائی کا دعویٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست خدائے لاشریک ہے جس کے مقابلے میں کسی دوسرے کے کوئی حقوق نہیں۔ ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ افراد سے بندگی کا مطالبہ کرے اور انہیں اس بات پر مجبور کرے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس کے تابع بن کر بسر کریں جسے یہ صحیح کہے اُسے صحیح مانا جائے اور جسے اس کی بارگاہ سے غلط ہونے کا فتویٰ مل جائے اُسے پوری قوم غلط تسلیم کرے۔ پھر جن لوگوں کے ہاتھوں میں مملکت کی باگ ڈور ہو انہیں بھی مبرا من الخطا مانا جائے اُن کی محبت اور عقیدت کو زندگی کی معراج سمجھا جائے اور ان کی پیروی اس ذوق و شوق کے ساتھ کی جائے جس جذب و انہماک کے ساتھ کوئی خدا پرست کسی پیغمبرِ برحق کی اطاعت کرتا ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ دیکھیے کہ ان دونوں نے جن تہذیبوں کو جنم دیا ہے اُن میں کتنی یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تہذیب اور اشتراکی تہذیب میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مذہب بیزاری، پیدائشِ دولت کے لیے اندھا جنون، کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے، بین الاقوامی تعلقات میں بے اصولی اور مادّی مفادات کی خاطر ہر دوسرے مفاد کی قربانی، دونوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ گذشتہ دس سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ سرمایہ پرست امریکہ اور برطانیہ اور اشتراکیت پرست رُوس کے طرزِ عمل میں کوئی معمولی سا فرق بھی پایا جاتا ہے؟ مفادات کا جنون ان سب کو ایک سا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ امریکہ جب اپنے مادّی مفادات پر کوئی آنچ آتے دیکھتا ہے تو کوریا اور ویت نام میں انسانی خون سے ہولی کھیلنے لگتا ہے اور لاکھوں معصوم انسانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے اور رُوس پر جب یہ جنون سوار ہوتا ہے تو وہ ہنگری اور چیکوسلاواکیہ پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ دستِ ظلم دراز کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اخلاقی ضابطے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا پابند دکھائی نہیں دیتا۔ انسان اپنے فعل سے، درخت اپنے ثمر سے اور نظامِ حیات اُس اجتماعی اخلاق سے پہچانا جاتا ہے جس کا مظاہرہ وہ زندگی کے مختلف معاملات میں کرتا ہے۔ جس طرح ایک خود غرض فرد ناقابلِ اعتماد ہے بالکل اسی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اجتماعی اخلاق پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان اور دنیائے اسلام کو ان ممالک نے نہایت فیصلہ کن مراحل پر جو دھوکے دیئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ان کے فکر و عمل کے سوتے ایک ہی جگہ سے پھوٹتے ہیں

سرمایہ دارانہ اور اشتراکی ممالک کے درمیان تعلقاتِ باہم کا جو اصول طے کیا گیا ہے یہ کسی انسانیت دوستی کا نتیجہ نہیں بلکہ چوروں کے مابین اُس اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ ہے جس کے تحت وہ یہ طے کرتے ہیں کہ تم ایک خاص حدود کے اندر لوگوں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناؤ اور ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے اور ہم دوسری حدود میں جب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں تو تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو گے۔ مفادات کی پرستش نے ان دونوں نظاموں کے علمبرداروں کو ایک دوسرے کا ہم عناں بنا دیا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انسانیت کو برباد کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کے درمیان تعاون کی راہیں اب اس قدر کشادہ ہو گئی ہیں کہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے معاملے میں تو ان کا طرزِ عمل بالکل ایک جیسا ہے۔ اشتراکیت اس بات سے خوش ہے کہ یہاں لوگوں کے اندر سرمایہ پرستی کا جنون پیدا ہو رہا ہے اور یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ اُن کے دلوں سے خدا اور اس کے رسول کی محبت ختم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ دنیا پرستی لے رہی ہے۔ یہ تبدیلی اشتراکیت کے لیے نہایت خوش آئند ہے۔ دولت کی محبت سے معاشرے میں ذہنی اور اخلاقی خلفشار پیدا ہوتا ہے جسے دُور کرنے کے لیے ریاست کا عمل دخل ناگزیر طور پر بڑھ جاتا ہے اور یہ سب چیزیں اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ جب یہاں اشتراکیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے، تو سرمایہ دار ممالک کو بے حد خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کسی دینی معاشرے کی بنیاد منہدم ہو رہی ہے

خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہے کہتے رہیں لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اشتراکیت دونوں میں سے کوئی ایک نظام بھی ایک لمحہ کے لیے مذہب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام تو خیر ایک انقلاب انگیز دین ہے اس لیے اس کے مقابلے میں مادہ پرستوں کا معاندانہ طرزِ عمل بالکل فطری ہے۔ ان لوگوں نے تو اُن مذاہب کو بھی گوارا نہیں کیا جن کا دائرہ صرف گیان دھیان تک محدود ہے۔ چین نواز اشتراکی جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ روسی اشتراکیت مذہب کی دشمن ہو تو ہو مگر اشتراکی چین مذہب کا بڑا خیر خواہ اور دوست ہے اور وہ مذہبی معاملات سے قطعاً تعرض نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو یہ اشتراکیت کی روح سے قطعاً ناآشنا ہیں یا یہ جان بوجھ کر عوام کو فریب دیتے ہیں۔ جب ایک قوم یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اُسے اجتماعی زندگی کو مادی سُود و زیاں کے مطابق تشکیل دینا ہے تو وہ آخر ایسے اصولوں اور نظریات کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے جو اس بنیادی اصول سے مزاحم ہوں۔ ماؤزے تنگ کی منتخب تحریروں میں جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت ملتی ہے کہ اسے مادی نقطۂ نظر کے علاوہ کوئی دوسرا نقطۂ نظر گوارا نہیں۔ میں یہاں اس کتاب کی پہلی جلد کے ص۲۶ سے ایک عبارت کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جس سے اس کی مذہب دوستی یا مذہب کے معاملے میں "رواداری" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

"جوں جوں کاشتکاروں کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے مذہبی اقتدار ہر جگہ منہدم ہونے لگا ہے۔ بہت سے مقامات پر کاشتکاروں کی انجمنوں نے عبادت گاہوں پر قبضہ کر کے انہیں دفاتر میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ انجمنیں ہر جگہ اس امر کا پرچار کر رہی ہیں کہ ان عبادت گاہوں کی املاک پر قبضہ کیا جائے اور ان کی مدد سے کاشتکاروں کے لیے سکول قائم کیے جائیں اور اس فنڈ سے انجمن کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ اس فنڈ کو وہ "توہمات کی سرکاری آمدنی" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔"

اسی مضمون کے اگلے صفحات یعنی ص۲۷ اور ص۲۸ پر ماؤ صاحب مذہب کے بارے میں سرکاری طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ خود عبادت گاہوں کو مسمار کرنے سے گریزاں ہیں مگر عوام کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ انہیں خود آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے تباہ کریں۔ اپنے اس فلسفہ کی تعبیر میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ انہیں کمان چلّے پر چڑھا دینی چاہیے اور پھر انتظار کرنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کو ہمارے معاملات سے جو کچھ دلچسپی اور ہمدردی ہے اُس کی نوعیت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ان دونوں کو ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کسی طرح مذہب کو ہم پسِ پشت ڈال دیں اور دینی اقدار سے نجات حاصل کریں، اور ہمارے اخلاق جن کی اساس اسلام ہے وہ برباد ہوں۔ چنانچہ ان دو مختلف نظاموں کے علمبردار ممالک ہمارے ہر اُس قول اور فعل کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں جس سے مذہبی انحراف کا پہلو نمایاں ہوتا ہو۔ ثقافت کے نام پر یہاں جس قدر بے حیائی پھیلائی جاتی ہے اُسے دیکھ کر انہیں بے حد مسرت ہوتی ہے۔ ہماری خواتین اگر اپنے اصل دائرۂ عمل کو چھوڑ کر بے حجابی کو اختیار کر لیں اور ناچ گانے کی محفلیں آراستہ کرا کے اس میں انہماک کا ثبوت دیں تو روس اور امریکہ دونوں کو بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسے مشاہدات نہیں جو کبھی کبھار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک ہمارے جن جن کاموں کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اُن کی نوعیت ملاحظہ کیجیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ انہیں ہماری کونسی روش پسند ہے اور ہماری کس روش پر وہ دونوں دل گرفتہ ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی ایک محترمہ چین یاترا سے واپس تشریف لائی ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات کئی محفلوں میں بیان کیے ہیں۔ اُن کے ان تاثرات کو ایک صاحبہ نے ۱۳ اکتوبر کے پاکستان ٹائمز میں بزمِ خواتین کے تحت قلمبند فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ چین میں مسلمان عورتوں کو بڑی آزادی ہے اور وہ زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ وہ بڑی اچھی مسلمان ہیں۔ اس کے بعد وہ پاکستانی عورتوں کے بارے میں چین کے عظیم رہنما چو۔ این لائی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ انہیں اس بے بس مخلوق سے بڑی ہمدردی ہے اور وہ جن دو باتوں کے بارے میں خاص طور پر فکر مند ہیں ان میں ایک پردہ ہے اور دوسرا تعددِ ازدواج۔ یعنی انہیں اس بات کی قطعاً کوئی فکر نہیں کہ دولت پرستی نے پاکستانی عورت پر بے جا بوجھ لاد دیا ہے اور مرد اُسے ایسے کاموں میں پھنسا رہا ہے جن سے اُسے پہلے آزادی حاصل تھی۔ اُس کے اخلاق کا جنازہ نکل رہا ہے۔ ان سب باتوں میں سے کوئی بات بھی چو این لائی صاحب کے لیے وجہ پریشانی نہیں۔ البتہ اگر کوئی بات وجہ اضطراب ہے تو وہ مسلم معاشرے میں عائلی زندگی کی دینی اساس یعنی حجاب اور تعددِ ازدواج کی اجازت۔

اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کے بارے میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے طرزِ عمل میں ہم آہنگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں کی بنیاد مادہ پرستی پر رکھی گئی ہے۔ اور دونوں اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ہی ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس بنا پر یہ دونوں قوتیں باہمی اختلاف کے باوجود اسلام کے معاملے میں پوری طرح متفق اور متحد ہیں اور ہر اُس تحریک کی پشت پناہی کرتی ہیں جس سے اسلام کے اسلامی تصورات کو تنزل کرنے میں مدد ملے۔ ان دونوں نظاموں کی ملی بھگت سے یہاں غیر اسلامی رجحانات کو پرورش پانے کے مواقع میسر آئے ہیں۔ غیر اسلامی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوا ہے، عوام زندگی کے معاملات کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور حل کرنے کے بجائے خالص مفاد پرستانہ نقطہ سے دیکھنے اور حل کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ دولت پرستی کے جنون نے اخلاق کو برباد کر دیا ہے اور زندگی اتنی غیر متوازن ہو گئی ہے کہ اُسے ریاست کا مضبوط اور آہنی ہاتھ ہی کسی نظم کا پابند بنا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کی جکڑ بندیاں روز بروز شدید سے شدید تر ہو رہی ہیں اور ایک مختصر سی اقلیت ریاست کی بے پناہ قوت کی مدد سے پُوری قوم پر مسلط ہے اور وہ معاشرتی اور معاشی دھاروں کو جس رُخ چاہتی ہے بہالے جاتی ہے۔ اسلام جس کے بارے میں باری تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ وہ سارے ادیان پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے، اُسے اجتماعی مفادات کا تابع بنایا جا رہا ہے۔ مساجد اور مذہبی مدارس جنہیں فی الحقیقت اسلام کے حصار کہنا چاہیے اُن کے اندر بھی برسرِ اقتدار طبقوں کے پسندیدہ رجحانات کو نفوذ کرنے کے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں اور اُن میں ایسی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں جو دینی نقطۂ نظر سے سخت خطرناک ہیں۔ اگر ایک مرتبہ یہ بات طے ہو گئی کہ مذہب ریاست اور اجتماعی مفادات کا تابع ہے تو پھر اسلام کبھی دنیا میں غالب قوت کی حیثیت سے نہیں اُبھر سکے گا بلکہ اس کا حشر وہی ہو گا جو سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک میں مذہب کا ہو چکا ہے۔ یعنی قوم مادی مفادات کے نقطۂ نظر سے جو چاہے کرتی رہے اور مذہب اس کی تائید کے لیے ہر وقت تیار رہے اور بالآخر پسپا ہوتے ہوتے ایک کونے میں سر چھپا کر بیٹھ جائے اور اس امر کا اعتراف کرے کہ وہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں کوئی رہنمائی دینے سے عاجز ہے۔ ان حالات میں اسلامی تعلیمات کی حیثیت کسی انقلاب انگیز دعوت کی نہ ہو گی بلکہ کلاسیکی ادب کی سی بن جائے گی جس کے بعض مخفی گوشوں پر چند سرپھرے تحقیق کر کے مختلف ڈگریاں حاصل کیا کریں گے۔ مساجد، معابد اور مکتب اسلامی تہذیب و تمدن کے گہوارے نہ رہیں گے بلکہ آثارِ قدیمہ (باقی صـ ۶۲ پر)

© rasailojaraid.com